جابر علی سید بہ حیثیت اقبال شناس

ڈاکٹر انیلہ سلیم

Abstract:

So many books are there on ideological analysis of Allama Muhammad Iqbal's poetry and philosophy but the technical characteristics of the great poet have always been neglected or ignored as he himself mentioned it in one of his private letters that may be he is not a poet in literary terminology, but as we see he is a great poet in both means I.e ideology and techniques of poetry.

This article specifically emphasises on the efforts of Professor Jabir Ali Sayyed in which he found all the technical qualities of allama's poetry.

The nature of jabir's analysis on iqbaliyaat is one of such a type that he presented prominently the technical characteristics of iqbal's poetry through practical criticism and it possesses an important place in the essence of iqbaliyaat's criticism, so in this article it has been tried to preserve this critical essence after highlighting it.moreover the critical analysis and research findings are presented alongwith the controversies of the contemporary critics.

کلامِ اقبال پر عملی تنقید جابر علی سید کے خصوصی مطالعات کا حصہ ہے جس میں انھوں نے فنی خصائص کی نشان دہی پر توجہ کی۔ فکرِ اقبال کو جس طرح فنی سانچوں اور تکنیکی مہارتوں کے ظروف میں ڈھالا گیا اس فن کا مطالعہ اور اخذ نتائج اقبالیاتی تنقید میں جابر علی سید کی خصوصیت ہے۔ اقبال شناسی کے ضمن میں جابر علی سید نے اقبال کا فنی ارتقا اور اقبال ـــ ایک مطالعہ کے زیرِ عنوان دو مجموعہ ہائے مضامین میں اقبال کی شاعری پر تحقیقی و تنقیدی مضامین قلم بند کیے ہیں جو علامہ اقبال کے کلام کے فکری اور خاص طور پر فنی حوالے سے جائزے پر مشتمل ہیں۔ فنی

حوالے سے جابرعلی سید نے علمِ عروض، لسانیات، فنونِ لطیفہ اور دیگر علوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقبال کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور زیادہ تر مقالات فطرت اور جمالیات کو ان کی فکر کی گہرائی میں تلاش کرنے پر مشتمل ہیں۔ اقبال کا فنی ارتقا میں گیارہ مضامین شامل ہیں۔ یہ مجموعۂ مضامین جولائی ۱۹۷۸ء میں 'بزمِ اقبال' لاہور سے منظر عام پر آیا۔ دوسرا مجموعۂ مضامین بہ عنوان اقبال – ایک مطالعہ بزمِ اقبال، لاہور سے جون ۱۹۸۵ء یعنی جابرعلی سید کی وفات کے بعد شایع ہوا۔ اس میں دس مضامین شامل ہیں واضح رہے کہ ان کے علاوہ دو مقالات بہ عنوان 'کلامِ اقبال میں صناعی کے عناصر' اور 'اقبال کا شعری اسلوب' بھی موجود ہیں۔

جابرعلی سید کے ان مجموعوں کی 'اقبالیات' میں فنی مباحث پر مشتمل تجزیات کے ضمن میں خاص اہمیت ہے۔ علامہ اقبال کے کلامِ پر فنّی سے زیادہ فکری حوالے سے ناقدین نے توجہ کی ہے۔ اقبال نے خود بھی اپنے کلام کے فکری پہلوؤں کو فنی باریکیوں پر مقدم سمجھا۔ اس کا ایک ثبوت سید سلیمان ندوی کے نام اقبال کے ایک خط کے متن سے دیا جا سکتا ہے جو یہ ہے:

> ''شاعری میں لٹریچر بہ حیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔'' (۱)

بیش تر فنی مباحث کی طرف پہلی بار جابرعلی سید ہی نے توجہ کی۔ بعد ازاں مزید تحقیق سے یہ مباحث واضح ہوتے چلے گئے۔ کچھ بحثوں میں جابرعلی سید فکر اور فن کو ساتھ لے کر بھی چلتے ہیں۔ مثلاً نظم ''شمع و شاعر کا تجزیہ'' اقبال کے ہاں لہجوں کے تنوع اور استفساریہ رنگ کی نشان دہی کرتے ہیں تو فکری توضیحات بھی پیش کرتے ہیں۔

جابرعلی سید کے یہ دونوں مجموعے اقبالیات میں ان کے مقام کے تعین میں اہم ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر افتخار حسین شاہ اپنے مضمون 'اقبالیات میں ملتان کا حصہ' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''دونوں مجموعے 'اقبالیات' کا ایک گراں مایہ حصہ ہیں۔ ان میں شامل مقالات موضوعات کے تنوع اور فنی لطافتوں کے عکاس ہیں۔'' (۲)

مقالہ بہ عنوان ''اقبال اور لفظ و معنی کا رشتہ'' جابرعلی سید کے لسانی نظریے سے تعلق رکھتا ہے۔ جابرعلی سید کے خیال میں لفظ اور معانی کے رشتے پر علامہ اقبال نے فلسفیانہ طریقہ کار سے روشنی ڈالی اور ان میں وہ رشتہ قائم کیا جو ان کا درست اور نمایاں حکیمانہ رنگ اجاگر کرتا ہے۔ اس سے پہلے ابن سینا، الفارابی، الکندی، غزالی، شعرانی، ابن عربی اور ابن رشد وغیرہ نے اس امر کو خالص فلسفے کے تحت پرکھا لیکن وہ اس رشتے کی دوئی کو برقرار رہنے سے نہ روک سکے۔ ان کے مطابق بات شبلی نعمانی اور مولوی نجم الغنی رام پوری کی کی جائے تو بھی لفظ اور معنی کے رشتے کی نوعیت میں تفریق کا عنصر موجود رہتا ہے۔ بعد کے ادوار میں علامہ اقبال نے شعر کی صورت میں اس ادبی فلسفیانہ بحث کو بیان

کیا اور لفظ و معنی کی عینیت کا راز فاش کر دیا۔ زیر تبصرہ مقالے کی بنیاد ضربِ کلیم میں شامل علامہ اقبال کے ایک قطعے ''جان و تن'' پر رکھی گئی ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

عقل مدت سے ہے اس پیچاک میں الجھی ہوئی
روح کس جوہر سے؟ خاکِ تیرہ کس جوہر سے ہے؟
میری مشکل؟ مستی و شور و سرور و درد و داغ
تیری مشکل؟ مے سے ہے ساغر کہ مے ساغر سے ہے

ارتباطِ حرف و معنی، اختلاطِ جان و تن؟
جس طرح اخگر قباپوش اپنی خاکستر میں ہے (۳)

جابر علی سید نے اس قطعے کے تخلیقی اسباب و محرکات تلاش کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ In all speech, 3. اس مقالے میں جابر علی سید نے ادب کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کی فلسفیانہ حیثیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان کے ہاں لفظ و معنی کی وحدت پر فلسفیانہ رنگ سے روشنی ڈالی ہے۔ جابر علی سید نے ادب، سائنس اور فلسفہ تینوں اعتبار سے اقبال کے نظریہ لفظ و معنی کو پرکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے مذکورہ قطعے سے قبل مابعد جدید طبیعیات کی وحدتِ زمان و مکان (Time Space) کو بدل کر اس کا عکس پیش کیا ہے۔ اقبال نے اسے Space Time کی متحد الاصل اصطلاح سے ظاہر کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی فلسفی، جو ہمیشہ کثرت کو وحدت کے روپ میں دیکھتا ہے ادب، مابعدالطبیعیات، شاعری اور علمِ معانی کے بنیادی مسائل کو پیش نظر رکھتے وقت اصولی طور پر وحدانی میتھڈ استعمال کرتا ہے جو ادبی اظہار کے سلسلے میں بہ ظاہر رونما ہونے والے قولِ محال کے چھلکے کو توڑ کر اپنی باطنی وحدت کو آشکار کر دیتا ہے۔'' (۴)

گویا ان کے مطابق اقبال نے لفظ و معنی کو کثرت سے وحدت کے رشتے میں پرویا ہے اور اس سلسلے میں فلسفیانہ اپروچ سے کام لیا ہے۔

جابر علی سید اقبال کے ہاں اصناف کے اجتہادی استعمال پر بحث کریں تو اس صنف کی ارتقائی صورت دکھاتے ہیں جیسا کہ ''سٹینزا اور ہماری شاعری۔ اقبال سے پہلے'' کے زیرِ عنوان مقالے میں اردو شاعری میں اس صنف میں شعرا کی طبع آزمائی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انھوں نے اصناف اور ہیئت کے حوالے سے تنقید کی ہے۔

کلامِ اقبال میں ہیئت کے تجربات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اور اب تک لکھا جا رہا ہے۔ جابر علی

سید نے کلام اقبال کی اس جہت پر محققانہ نظر ڈالی ہے اور اِس سلسلے میں اپنے مشرقی ومغربی ادب کے تقابلی انداز سے بھرپور کام لیا ہے۔

اصناف سخن میں صنف 'قطعہ' جابر علی سید کا توجہ کا خاص مرکز رہی ہے۔ اس صنف سخن سے تقابل کے ضمن میں رباعی کے عروضی مباحث بھی انھوں نے چھیڑے ہیں۔ مذکور مضمون کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ انھوں نے مطلع ادب پر کلام اقبال سے قبل ہماری شاعری میں اسٹینزا کی روایت پر روشنی ڈالی ہے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ جابر علی سید نے صرف اردو شاعری ہی میں سٹینزا کی روایت کا ذکر نہیں کیا بل کہ انگریزی شاعری میں موجود Stanza, Couplet, Triplet, Quatrain, sextant, octave, spensarian stanza اور Sonnet کی ہیئتوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ انھوں نے مقالے کے آغاز میں نشان دہی بھی کی ہے کہ اس مقالے کی صورت میں، اردو فارسی اور انگریزی شاعری کا صنفی موازنہ زیادہ واضح اور معنی خیز ہو جائے گا۔

ان کے مطابق اس مقالے کی بنیاد عبدالحلیم شرر کی اس رائے پر ہے جو انھوں نے نظم طباطبائی کی مترجمہ نظم 'گورِ غریباں' کے تعارف کے طور پر پیش کی ہے:

> ''ایسی مقبول روزگار اور سرمایۂ انگلستان نظم جس کا ترجمہ ہمارے واجب التعظیم علامہ اور مستندِ زمانہ شاعر جناب مولوی حیدر علی صاحب نظم طباطبائی (صحیح نام علی حیدر ہے) نے کیا ہے مگر کس خوبی سے جس کا اظہار کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ ایسی جاں گداز اور موثر نظمیں اور جنل طور پر اردو میں کم لکھی گئی ہیں، نہ کہ ترجمہ اور پھر اس پابندی کے ساتھ کہ جس طرح پہلے مصرع کا قافیہ تیسرے مصرع سے اور دوسرے کا چوتھے مصرع سے انگریزی میں ملتا ہے۔ اس طرح ہمارے مولانا نے بڑے لطف سے اپنی طرز قافیہ بندی کو چھوڑ کر اردو میں ملایا ہے۔ اردو میں اسٹینزا کہنے کی ابتدا اس نظم سے ہوتی ہے۔''(۵)

اس مقالے میں جابر علی سید کے تحقیقی وتنقیدی نکات آپس میں ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ وہ تنقیدی سطح پر اسٹینزا اور قطعے کی مترادف صورت بنا دینے کے ساتھ ہی تحقیقی حوالے سے اردو کے ایسے شعرا کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے قطعہ نگاری اور پھر قطعہ بند نظموں کی طرف توجہ کی۔

جابر علی سید کو قطعہ اور سٹینزا کی ہیئت سے فطری دل چسپی تھی۔ چناں چہ انھیں اسٹینزا کی وسعت، ایجاز اور تنوع، جامعیت اور تفصیل بندی، آہنگ اور لہجے کے اعتبار سے اس حد تک نظر آتی ہے کہ وہ اسے پوری شاعری کے مدِّ مقابل لے آتے ہیں۔ ذوق کا شعر ہو یا میر کا قطعہ، حالی کی رباعی یا اقبال کا ہفت شعری بند، یا پھر راشد کے کینٹوز___ وہ اسی تناظر میں دیکھتے ہیں اور ان کے نزدیک اسٹینزا میں موجود ایجاز پسندی میں وسعت، وسعت میں ایجاز وادراک زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جابر علی سید کے خیال میں داخلیت اور خارجیت، امیجری اور استعارہ جیسے

محاسن سب اسٹینزا میں موجود ہیں۔

اپنے ہر تحقیقی وتنقیدی مقالے کی طرح اس مقالے کے آخر میں جابر علی سید نے تحقیقی اشارات فراہم کیے ہیں، جیسے:

> ''اسٹینزا نظم اور نظم شاعری کا مترادف ہے۔ ہماری غزل اگر تسلسل کے دام میں گرفتار کی جا سکے یا کم از کم اس میں موڈ کی وحدت داخل ہو سکے تو غزل مسلسل بھی اسٹینزا متصوّر ہوگی....معروف مسلسل غزلوں کے علاوہ ہمیں ایسی اور غزلیں بھی تلاش کرنی چاہییں جو نظم سے بہت نزدیک ہیں یا کم از کم یہ کرنا چاہے کہ کلیم الدین احمد کی طرح بہ ظاہر غیرمدوّن غزلوں کو (مثالیں: درد اور غالب کی ایک ایک ٹیپکل غزل، دیکھیے 'اردو شاعری پر ایک نظر') مدوّن کر سکیں اپنے تخیل اور تصور کی مدد سے، تا کہ وہ خیال اور احساس کی جمالیاتی تدوین کی مثالیں نظر آئیں یا بن جائیں۔'' (۶)

اگلا مقالہ ''اقبال کا فنی ارتقا'' ہے۔ اقبال کے فنی ارتقا سے زیادہ اس مضمون کو اصناف شعری کے سلسلے میں اقبال کے اجتہادات سے عبارت کرنا چاہیے۔ اقبال کا یہ فنی ارتقا، بانگ درا اور بالِ جبریل تک ہی محدود رکھا ہے۔ آغازِ مقالہ ہی سے جابر علی سید واضح کرتے ہیں کہ اقبال کی جمالیات ہو، فکری و ذہنی ارتقا ہو، لفظیات ہو یا پھر فنی ارتقا ان سب کا نقطۂ اوّلین 'ہمالہ' اور نقطۂ عروج 'مسجدِ قرطبہ' ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''....اس طرح ہمالہ سادہ مجازی ثقافت کا نقطۂ اوّلین ہے اور نقطہ معراج 'مسجد قرطبہ' دونوں میں کم و بیش تیس سال کا فصلِ زمانی ہے گویا اقبال کی آئیڈیل ثقافت کے ارتقاے فنی کو تین پوری دہائیاں لگیں اور اس درمیان میں اس عالمی ثقافت اور فطری طرز زندگی کے خیالات مختلف پیرایوں میں ظاہر ہوتے رہے یہ پیرائے وہ فنی ہیئتیں ہیں جو بیت سے شروع ہو کر طویل نظموں میں مشتکل ہوتی رہی ہیں۔ قطعہ مختصر یا طویل، رباعی، غزل، مثنوی نما مختصر نظم، مثنوی نما طویل نظم مثلاً 'ساقی نامہ' لیکن قطعہ بند نظم ہی وہ ہیئت ہے جو اقبال کے فنی ارتقا کی مظہر ہے اور بلند ترین مظہر'' (۷)

جابر علی سید نے کلامِ اقبال کی موضوعاتی وفکری جہت پر بہت کم بل کہ نہ ہونے کے برابر لکھا ہے لیکن جہاں کہیں بھی کلامِ اقبال کے فکری ارتقا پر بات کرتے ہیں، وہاں محققانہ رنگ نظر آتا ہے۔ مثلاً انھیں موضوعات کا تنوع بالِ جبریل سے زیادہ بانگِ درا میں نظر آتا ہے اور اس دعوے کو یوں پیش کرتے ہیں:

> ''اقبال کے موضوعات کا زبردست تنوع بانگِ درا میں ہے۔ اس اعتبار سے یہ بالِ جبریل پر برتری رکھتی ہے۔ بانگِ درا کی دنیا بہت وسیع ہے اور ایک طویل احساساتی عمر کا حاصل ہے، یعنی کم و بیش تیس سال کو محیط ہے اور ایک حسّاس اور پرجوش نوجوان شاعر کا کینوس کتنا وسیع ہوسکتا ہے۔ اس کا اندازہ بانگِ درا کی پہلی

ہوئی دنیا سے ہوسکتا ہے۔ بانگِ درا ایک بہت بڑا شہر ہے جس کے مختلف اور متعدد
حلقے اپنی الگ دنیا رکھتے ہیں۔ بالِ جبریل کی دنیا بھی بڑی وسیع ہے لیکن اس میں
بانگِ درا کے تنوع کی بجائے نظم کا ارتقا زیادہ جاذبِ توجہ ہے۔'' (۸)

یوں وہ نے بانِگ درا اور بالِ جبریل کا موضوعاتی تقابل مختصراً پیش کر دیتے ہیں۔ اس مقالے میں جابر علی سیّد نے فکر و فن کو یک جا کر کے بھی پیش کر دیا ہے۔ فنی ہیئتوں، اصناف اور اس ضمن میں اقبال کے اجتہادات کے ذکر کے ساتھ ہی وہ متذکرہ اصنافِ سخن میں وہ اقبالیاتی فکری تنوعات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ کہ جاوید نامہ کا فنی تجزیہ کرتے ہوئے مفصل فکری بحث کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ جابر علی سید نے فکر اور فن کو جس طرح پیشِ نظر مقالے میں مجتمع کر دیا ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

''...... جاوید نامہ ایک عظم خواب کی عظیم تعبیر ہے۔ ایک عظیم پیکر میں یہ گویا تاریخ
عالم کا خلاصہ ہے اور تاریخی اشخاص کے کردار اور کیفر کی فن کارانہ تعبیر۔'' (۹)

تنقید نگار اقبال کی شاعری کے ادوار متعین کرتے ہیں تو بھی ان کے شاعرانہ ارتقا کو فکری و ذہنی ارتقا تک محدود کر دیتے ہیں۔ جابر علی سید نے اقبال کے ہاں فنی رموز پر قلم اٹھاتے ہوئے شعری اصناف، اور ہیئتوں کے حوالے سے لکھا اور پھر فکر سے ہیئت کی مناسبت کے حوالے سے اہم نکات بھی اٹھائے۔ اقبال کا فنی ارتقا میں بھی جابر علی سید کی یہ انفرادیت بہ درجہ اتم موجود ہے۔

زبان عربی کے مشہور شاعر ابوالعلامعری (صاحب غفران ولزومیات) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ گوشت نہیں کھاتا تھا بل کہ پھل سبزی پر گزر اوقات کرتا تھا۔ جابر علی سید نے اس کی مماثلت ایرج میرزا کی نظم ''بقای انسب'' سے دریافت کی۔ ان کے مطابق علامہ اقبال نے اسی نظم سے اخذ شدہ خیالات کو ایک شعر کے اضافے کے ساتھ 'ابوالعلامعری' کے زیرِ عنوان 'بالِ جبریل' میں شامل کیا ہے۔ جابر علی سید فارسی زبان کے استاد تھے۔ انھوں نے دونوں شعرا کے متون میں فکری مماثلتیں تلاش کیں اور اقبال کے فنی معیار کی بلندی کو اپنے نکات کی مختصر صورت میں پیش کیا ہے۔

ایرج اور اقبال کی 'بقای انسب' اور 'ابوالعلامعری کی فکری و فنی مماثلتوں کا بیان جابر علی سید کی وسعتِ مطالعہ پر دلالت کرتا ہے۔ ''کلیات اقبال'' میں دیوان اللزومات، کے حوالے سے لکھے گئے حاشیے پر تبصرے کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ لزومیات کہ ابوالعلا المعری کے قصائد کا مجموعہ ہے بل کہ قافیے اور بحر کی پابندی کی وجہ سے اقبال نے ،لزومیات، کولزومات، لکھا ہے۔

فنی حوالے سے جابر علی سید نے اقبال کی شاعری میں مستعمل اصناف کے ساتھ ساتھ بعض فنی تکنیکوں پر بھی توجہ کی ہے۔ مثلاً اقبال کے ہاں، خطابت، استفسار اور لہجوں کے انتخاب پر لکھتے ہیں تو اور اس حوالے سے مختصر ہی سہی لیکن بہت عمدگی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے مطابق بے شک اقبال نے ڈراما کو باقاعدہ

ایک صنف کے طور پر استعمال نہیں کیا لیکن ڈرامے کے بنیادی عناصر ان کی شاعری میں جا بہ جا مل جاتے ہیں۔ ان عناصر کی فراواں موجودگی کے باعث یہ کلامِ اقبال کا امتیازی وصف ٹھہرتا ہے۔ جابر علی سید نے اقبال کے کلام کے فنی رموز و خصائص کے سلسلے میں متذکرہ فنی امور پر اپنے درج ذیل چار مقالات میں تفصیلاً روشنی ڈالی ہے:

(i) اقبال کے تین لہجے (اقبال کا فنی ارتقا)

(ii) مکالماتی نظم ___ اقبال کا ایک فنی پیکر (ایضاً)

(iii) اقبال اور خطابیہ نظم (ایضاً) اور

(iv) اقبال اور ذوقِ استفسار (اقبال ___ ایک مطالعہ)

اقبال کے ہاں لہجوں کا تنوع حکیمانہ، فلسفیانہ، طنزیہ (شکوے) پر مبنی جذباتی اور نشاطیہ رنگ میں نمایاں ہوتا ہے۔

جابر علی سید نے اقبال کے ان متنوع لہجوں میں سے تین بنیادی لہجوں (ا) نشاطیہ (ب) فکریہ اور (ج) حزنیہ۔ کے بارے میں تفصیل سے کلامِ اقبال سے امثال کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی شاعری میں ہمیں تین بڑے، معنی خیز اور بنیادی لہجے محسوس ہوتے ہیں: نشاطیہ جو غزلیہ ہے۔ فکریہ جو اس کے فلسفے اور پیغام سے پیدا ہوتا ہے اور حزنیہ جو پہلے دو لہجوں کے مقابلے میں کم زور واقع ہوا ہے، لیکن اس کا گہرا احساس اور معنویت ضرور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔'' (۱۰)

فنی حوالے سے جابر علی سید نے جب بھی کلامِ اقبال پر قلم اٹھایا ہے، آغاز بانگِ درا کی اوّلین نظم ''ہمالہ'' ہی سے ہوا ہے۔ لہجے کے سلسلے میں بھی 'ہمالہ' پر پہلے بات کی ہے جس میں انھیں نشاطیہ اور طربیہ لہجے کی آمیزش نظر آتی ہے۔ جابر علی سید کے مطابق اقبال کی شاعری کا اوّلین دور بہجت و طرب کا عہد ہے۔ دوسرا دور فکریہ ہے جو ۱۹۰۸ء سے بالِ جبریل کی اشاعت پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا لہجہ 'حزنیہ' ہے اور اس کا تعلق اقبال کی حساسیت سے جوڑا گیا ہے۔ ان کے مطابق یہ تینوں لہجے فکرِ انسانی کی تین بنیادی حالتوں سے جنم لیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جابر علی سید نے اقبال کی حساسیت اور حزنیہ لہجے کی وضاحت کے لیے مشرق ومغرب کے تخلیقی شاہ پاروں کا حوالہ دیتے ہوئے کی ہے۔ جابر علی سید نے نہ صرف شعری سطح پر اقبال کی فکر کے مآخذ تلاش کیے ہیں وہیں اس فکر کی مطابقت مغرب کے ادبا سے قائم کی ہے۔ جابر کے ہاں مغرب پسندی ملتی ہے جسے مغرب پرستی نہیں کہہ سکتے۔ ان کے ہاں عالمی معیارات سے تقابل ومماثلت کی تلاش ان کی وسعتِ مطالعہ پر دلالت کرتا ہے۔

جابر علی سید نے اقبال کے ان لہجوں کا تذکرہ اصناف اور ہیئت کے انتخاب کے حوالے سے کیا ہے۔ اصناف، ہیئت، بحور و اوزان اور لسانی مباحث چوں کہ جابر علی سید کی تنقید کے خاص میدان ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے ہر مقالے میں ان علوم کی سرحدوں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً بات اقبال کے لہجوں کی ہو تو جابر اقبال کے نشاطیہ لہجے کو صنف غزل میں پروان چڑھتا دیکھتے ہیں۔ یوں وہ غزل اور انگریزی صنفِ شعر Lyric کا موضوعاتی وفکری

تقابل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال کے ڈکشن اور لسانی مہارت کے حوالے سے جا بہ جا وقیع آرا کا اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''وہ (اقبال) واحد شاعر ہے جو اردو جیسی ترقی پذیر زبان میں خالص اور تنظیم یافتہ تجریدی تصورات کے اظہار پر قدرت رکھتا ہے۔۔۔۔۔ احباب کے اصرار پر اقبال نے اردو شاعری کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا اور اپنے عمیق خیالات اور ایک مستقل بالذات تصورِ زندگی کے نقوش ابھار کر اسے ایک ترقی یافتہ زبان بنا دیا جو فارسی کے لیے بھی باعثِ رشک ہے۔'' (۱۱)

اقبال کے ان تین بنیادی لہجوں سے جنم لینے والے ذیلی لہجوں میں سے فلسفیانہ لہجے پر جابرعلی سید نے بہ تفصیل اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فلسفیانہ لہجے میں نشاط و تفکر کے ساتھ ساتھ حزنیہ کیفیات کو بھی دخل ہوتا ہے اور یوں اقبال کے تینوں لہجے ایک فلسفیانہ تعلق میں سمٹ آتے ہیں۔ غور کیا جائے تو فلسفیانہ لہجہ اقبال کے پورے شاعرانہ اسلوب کو محیط ہے کیوں کہ جابر کے مطابق اقبال کی شاعرانہ اور فلسفیانہ حیثیات ایک دوسرے کے متضاد نہیں بل کہ متوازی چلتی ہیں۔ جابرعلی سید کے خیال میں:

> ''اقبال کے فلسفیانہ لہجے اور شاعرانہ لہجے میں اتنا کم فرق ہے کہ بعض دفعہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ اس کی استعارہ پسندی، متغزلانہ زبان اور خوش آہنگی ہے جو فلسفے کو شاعری بنا دیتی ہے۔ وہ ایسا غزل خواں ہے جس کا سوز اور نشاط انگیزی اندیشۂ دانا (عقل) کو جنوں آمیز (عشق) بنا دیتی ہے۔ اقبال کے فلسفیانہ لہجوں میں یکسانی اور تکرار نہیں بل کہ تنوع اور رنگینی ہے۔ یہ خوبیاں شعری صناعی، علامات اور بالواسطہ طرزِ اظہار سے پیدا ہوتی ہیں۔'' (۱۲)

اقبال کے ہاں خطابیہ انداز/ لہجے کی فراوانی پر مکالماتی نظم کی ذیل میں بھی جابرعلی سید نے تفصیلی بحث کی ہے۔ اس سلسلے 'اقبال اور خطابیہ نظم' میں انھوں نے زیادہ تر انگریزی صنف Ode کو بنیاد بنا کر خطابیہ نظموں کا موازنہ و تقابل کیا ہے۔

اس مقام پر جابرعلی سید کی وسعتِ مطالعہ کا یوں بھی اظہار ہوا ہے کہ وہ اقبال کی خطابیہ نظموں کے فکری ماٰخذ بھی سامنے لائے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ 'گل پژمردہ' رومی اور افلاطون کی روایت میں ہے لیکن اسلوب اور ہیئت کی رنگینی اور دل کشی میں اقبال کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ نیز یہ کہ فکری حوالے سے یہ ورڈز ورتھ کی Ode to immortality سے متاثر ہے۔ ورڈز ورتھ نے حزنیہ جب کہ اقبال نے فلسفیانہ لہجہ برتا ہے۔ اسی طرح اقبال نے جو داغ کا مرثیہ لکھا ہے وہ آرنلڈ کے مرثیۂ ورڈز ورتھ سے ماخوذ ہے۔ جابرعلی سید نے ایک نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی نظموں میں جن میں خاصی تعداد خطابیہ قسم کی نظموں کی ہے، اقبال شیلے کی طرح Fitful

Thinker نظر آتے ہیں۔

جابر علی سید نے تقابل کی جو فضا خطابیہ نظم اور Ode کے سلسلے میں تخلیق کی ہے۔ اس سے بہ آسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انگریزی صنف کے معیار پر ہیئتی حوالے سے اقبال کی خطابیہ نظموں کو پرکھا جائے تو اقبال کی انفرادیت مزید نکھری ہوئی صورت میں اجاگر ہوتی ہے۔ ویسے بھی خطابت کا تعلق ہیئت سے نہیں لہجے اور انداز سے ہے، اسی طرح استفسار کا تعلق بھی مکالمے سے ہے۔ جابر علی سید کے مطابق:

> ''اقبال نے استقصائے شعری کے باب میں متعدد ٹکنیکس برتی ہیں اور ہمیشہ اسلوب اور پیرائے میں فنی جدت طرازی کا ثبوت پیش کیا ہے جس سے فلسفہ اور مابعدالطبیعیات کے تمام پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کر لیا گیا ہے۔ مکالماتی نظموں میں خصوصاً اور عام نظموں میں عموماً شاعر نے اپنی ذات کو مختلف اہم عالمی شخصیتوں سے Identify کر کے اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا ہے۔'' (۱۳)

اقبال اور ذوقِ استفسار کی تفصیل کے سلسلے میں جابر علی سید کا کا فلسفیانہ مطالعہ اپنی بھرپور جھلک دکھاتا ہے۔ مثلاً انھوں نے استفہام، اس کی نوعیت، اقسام اور لہجوں کے ذکر سے پہلے فلسفہ، مذہب اور تشکیک کے تحت کلامِ اقبال میں استفہامی عناصر کا جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں جابر علی سید نے فلسفیانہ روایات و اصطلاحات کو اپنی بحث میں شامل رکھا ہے۔ یوں تاریخ فلسفہ پر ان کی دسترس سامنے آتی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

> ''تشکیک اور ایمان میں صرف ایک سانس کا فاصلہ.... تشکیک اور ریب کو مختلف فلاسفہ نے مختلف کھونٹیوں پر ٹانگا ہے۔ ان میں مقبول ترین ابیقوریت ہے لیکن ابیقوریت کو غلط معنی پہنائے گئے ہیں اور اسے عشرت کوشی سے عبارت کر دیا گیا ہے۔ حال آں کہ مسرت ایک خالصتاً اور بنیادی طور پر اخلاقیات کا مسئلہ ہے۔ اخلاقیات میں مسرت سب سے بڑی نیکی ہے اور جدید ترین مغربی ذہن کے نزدیک، بہ شرطے کہ وہ مقاویر اور حظائظ میں توازن قائم رکھ سکے، یہ فلسفۂ مسرت پرستی سب سے معقول نظریۂ حیات ٹھہرتا ہے۔ خیام اسی فلسفے پر عامل رہا ہے۔'' (۱۴)

گویا ان کے مطابق اقبال کے ہاں سوال کا وجود محض گنجلک اور پیچیدہ افکار کی نمود سے عبارت نہیں ہے۔ بل کہ یہ تجسس سے ابتدا کر کے فکر کی گتھیاں سلجھانے کی ایک تکنیک کا نام ہے جس میں تشکیک کا وجود نمو نہیں پا سکتا۔ اقبال کے سوالات فکری پختگی کے حامل ہیں۔

''اقبال کی ایک غزل'' پروفیسر فتح محمد ملک کے ایک مضمون 'اقبال کی غزل' (۱۵) کے ردِعمل میں لکھا گیا ہے۔ فتح محمد ملک نے علامہ اقبال کی غزل کے موضوعات کے ساتھ ساتھ فنی تکنیک پر وقیع بحث کی ہے اور جابر علی سید نے اس مضمون کے ایک نکتے پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ فتح محمد ملک نے غزل پر عظمت اللہ خان اور کلیم الدین احمد

کے اعتراضات پر چوٹ کی ہے اور اقبال کے حوالے سے کہا ہے کہ اقبال کے نزدیک فکری اور عملی فیضان کا سرچشمہ غزل ہے پر اور ان کے ہاں آغاز کی غزل میں تقلید کے باوجود انفرادی فکری شعور کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے یورپ روانگی سے قبل ہی رسمی اور تقلیدی شاعری ختم کر دی تھی۔اس مضمون میں اقبال کی ایک غزل (جس پر مارچ ۱۹۰۷ء کا عنوان درج ہے) کے حوالے سے ایک اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے جو یہ ہے:

> ''یہ غزل اقبال کی آئندہ شاعری کا منشور ہے۔ آگے چل کر جو تصورات اقبال کے فکر وفن کا محور قرار پائے وہ سب اس میں موجود ہیں۔ مادیت کے استبداد اور تہذیب مغرب کے زوال سے لے کر سلطانی جمہور کی نوید اور اس نئی دنیا کے لیے ایک نئے نظام فکر کی تشکیل کے لیے اپنے فنی عزائم پر اعتماد تک بہت سے تصورات، اس ایک غزل میں سمٹ آئے ہیں۔ یہاں مجھے خلیفہ عبدالحکیم یاد آتے ہیں جنھوں نے جہاں کہیں بھی اس غزل کا حوالہ دیا ہے اسے نظم کہا ہے شاید اس لیے کہ یہاں نہ تو تغزل کا رسمی اور فرسودہ انداز موجود ہے اور نہ ہی غزل کی روایتی پریشان خیالی اور عدم تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ خود اقبال نے اپنی اس نادر تخلیق کو نہ صرف بانگِ درا، کے حصہ غزلیات میں جگہ دی ہے بل کہ خلافِ معمول اس کی تخلیق کی تاریخ بھی درج ہے بعد کی غزلیات پر نظم کی سی تعمیری شان اور فکری تنظیم کی چھاپ رفتہ رفتہ گہری ہونے لگتی ہے۔'' (۱۶)

درج بالا اقتباس میں موجود نکات پر جابر علی سید نے طنزیہ لہجے میں تنقید کی ہے اور واضح ہو جاتا ہے ان کا مضمون فتح محمد ملک کی غلط فہمیوں کے خلاف ایک واضح ردِعمل ہے۔ جابر علی سید اس مضمون کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''اقبال کی غزل' ایک ایسی تخلیقی Heresy ہے جس میں اقبال کی غزل کو نظمانے کی ناکام کوشش کی گئی ہے میں سمجھتا ہوں کہ نظمانے کی یہ کوشش اتنی کامیاب بھی نہیں جتنی پروفیسر کلیم الدین احمد کی وہ کوشش جو غالب اور میر درد کی ایک ایک غزل کو مربوط بنانے کے سلسلے میں بروئے کار آئی ہے۔'' (۱۷)

زیادہ تر اقبال کی شاعری سے ان کے تصورفن کو اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ جابر علی سید کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اقبال کے نثری آثار بالخصوص نجی خطوط سے اقبال کا تصورفن اخذ کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے پیش کردہ نظریے میں قطعیت اور وضاحتی انداز موجود ہے۔ اگرچہ یہ نظریہ واضح ضرور ہے لیکن مربوط و منضبط نہیں ہے۔ جابر علی سید نے اقبال کے نجی خطوط میں بیان کردہ نظریہ فن کو ان کی شاعری کی امثال سے واضح کیا ہے۔

کلامِ اقبال پر تحقیق وتنقید کے حوالے سے ایک سوال ہمیشہ اٹھایا جاتا رہتا ہے کہ معاصر صورتِ حال میں اقبال کی فکر سے کس طرح مدد لی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ اقبال کی فکر اور نظریات کے جدید اردو شاعری پر کیا

اثرات مرتب ہوئے کہ اس مقالے کا تیسرا حصہ اسی نکتے پر مبنی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اقبال کولرج، آرنلڈ یا ٹی ایس ایلیٹ کی طرح آخری باقاعدہ نقاد نہیں لیکن ان کے تنقیدی نظریات ان کے نجی خطوط اور شاعری میں مل جاتے ہیں۔ دوسری طرف شاعری میں یہ نظریات استعارے میں ملفوف ہوتے ہیں۔ جدید شاعری پر اقبال کے نظریہ فن کے اثر کو واضح کر کے جابر علی سید نے درج ذیل الفاظ میں اقبال کو بہترین خراج تحسین پیش کیا ہے:

> ''اقبال کا اثر ظاہر ہے ہم ان سے علامات کا استعمال سیکھ سکتے ہیں، قدیم الفاظ کو جدید معانی بخشنے کا طریقہ جان سکتے ہیں اور الفاظ کے انتخاب، ان کے صوتی اور معنوی پہلوؤں سے واقف ہو سکتے ہیں۔ قدیم اور جدید میں وحدت کیسے پیدا کی جا سکتی ہے؟ بے جان الفاظ میں روح تازہ کیسے دوڑائی جا سکتی ہے؟ یہ سب کچھ ہم ان فنی پیکروں سے سیکھ سکتے ہیں جن کا نام کہیں 'ساقی نامہ' ہے کہیں 'ذوق وشوق' اور کہیں 'مسجد قرطبہ' '' (۱۸)

کلامِ اقبال کی تنقید کے ضمن میں جابر علی سید کا تخصیصی پہلو یہ ہے کہ انھوں نے کلامِ اقبال کے فنی محاسن کی طرف نظر کی۔ اقبال کا فنی ارتقا کی طرح اقبال–ایک مطالعہ میں شامل تمام مضامین بھی فکر سے زیادہ فن کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔ اقبال ایک مطالعہ میں شامل مقالہ بہ عنوان ''اقبال اور فطرت'' جابر علی سید کا تحریر کردہ طویل مقالہ ہے۔ یوں تو عنوان ہی سے اس مقالے کے مشمولات کا دائرہ کار معلوم ہو جاتا ہے۔ لیکن پس منظری تفصیل دیکھیں تو یہاں اقبال کے ہاں فطرت نگاری سے زیادہ فارسی، اردو اور انگریزی شعرا کے ہاں فطرت نگاری کی روایت اور فطرت کے ادبی مفہوم پر کثیر معلومات مل جاتی ہیں۔ جابر علی سید نے اس مقالے میں اپنے تحقیقی وتنقیدی نکات کو سترہ حصوں میں تقسیم کیا ہے جس میں سے پہلے گیارہ حصے فطرت نگاری کی مشترکہ روایت پر مبنی ہیں اور ۱۲ سے ۱۷ تک قائم کیے گئے حصوں میں کلامِ اقبال میں فطرت نگاری کی مختلف جہات کا ذکر ہے۔

اس مقالے کا اہم ترین حصہ وہ ہے جہاں جابر علی سید نے کلامِ اقبال میں فطرت کے عناصر کی تلاش کی ہے۔ وہ مرحلہ وار اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ اقبال کے تاثر پذیر ذہن نے شیکسپیئر، دانتے، گوئٹے، ورڈز ورتھ، کولرج، شیلے، کیٹس، بائرن، ٹینی سن، ہائنے، شلر اور برڈر کی فطرت پسندانہ شاعری سے ٹکرا کر رومانوی طرزِ احساس میں جھلکتے دل کشا نغمات تخلیق کیے۔ جابر علی سید نے اقبال اور مغربی شعرا کے کلام میں فطرت نگاری کے حوالے سے جو مماثلتیں تلاش کی ہیں وہ کچھ یوں ہیں:

> ''بانگِ درا کی ابتدائی بیسیوں نظمیں صرف اور صرف ورڈز ورتھ کے نظریۂ فطرت کی صدائے بازگشت ہیں... اقبال نے ورڈز ورتھ سے سینئر پوئٹ سیموئل راجرز کی نظم 'A Wish' کو بھی اپنا لیا ہے اور اس کا نام 'ایک آرزو' رکھا ہے۔ راجرز کی آرزو یہ ہے کہ دامنِ کوہ میں میرا ایک بستر ہو: Mine be a coat by the mountain

side اور اقبال کی تمنا ہے: دامانِ کوہ میں اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو' (۱۹)

اقبال کے یورپ جانے سے قبل کی منظومات میں جابر علی سید نے جن عنوانات کو گنوایا ہے وہ تمام دو بڑے دائروں یعنی حبِ وطن اور فطرت نگاری کی اعلیٰ مثالوں میں سما جاتے ہیں۔ اس طرح کی نظمیں میں 'آفتاب'، 'ابر کہسار'، 'گلِ رنگیں'، 'گلِ پژمردہ'، 'آفتابِ صبح'، 'شمع و پروانہ'، 'ایک آرزو'، 'انسان اور بزم قدرت'، 'ماہِ نو'، 'پیامِ صبح'، 'شاعر'، 'موجِ دریا'، 'چاند'، 'جگنو'، 'ابر اور کنارِ راوی' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں میں رومانوی طرز کی فطرت نگاری ملتی ہے۔

جابر علی سید نے اقبال کی فطرت پسندی کو سب سے زیادہ ورڈز ورتھ کے ساتھ منسلک کیا ہے کہ ان کے مطابق اقبال ہمہ اوستی نظریے میں ورڈز ورتھ سے بہت قریب تھے مثلاً: Immortality ode کے آخر میں ورڈز ورتھ کہتا ہے:

"To me the meanest flower that grows can give thoughts
that do often lie too deep for tears.(20)

اسی بات کو اقبال یوں کہتے ہیں:

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود (۲۱)

وہ بتاتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک پھول محض رنگ و بو کا پیکر نہیں بل کہ وہ اس تخلیق کو حساس اور نازک طبیعت سے محسوس کرتے ہیں اور فلسفیانہ نکات کی تشکیل میں مدد لیتے ہیں۔ جابر علی سید کا موقف یہی رہا ہے کہ یہ سطح پر ورڈز ورتھ اقبال کا محبوب ہے لیکن فلسفیانہ اور نظریاتی سطح پر ان کا ماڈل کولرج ہے، ورڈز ورتھ نہیں اور یہ بھی کہ کولرج کی ادبی خودنوشت "Biographia Literaria" ضرور اقبال کی نظر سے گزری ہوگی۔ خود کولرج کی مذکور تصنیف کا اثر جابر علی سید پر بھی گہرا تھا کہ انھوں نے اسی طرز پر اپنی ادبی خودنوشت لکھنے کی کوشش کی۔

جس دور میں جابر علی سید نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اقبال کے حوالے سے اس موضوع تحقیق وتنقید پر نہ ہونے کے برابر کی گئی تھی۔ جابر علی سید کا یہ مقالہ اس وسیع موضوع کے لیے راہیں ہموار کر گیا۔ فطرت کی تکمیل میں انسان کی کاوش کا کیا کردار ہے۔ اس حوالے سے جس نکتے کی ہم نوائی جابر علی سید کرتے ہیں وہ درج ذیل ہے:

> ''آرٹ کے ذریعے انسانی ذہن ایسے تصورات بناتا ہے جو حقیقت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں بل کہ اس کی کوتاہی کی تکمیل کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ انسان فطرت کی نوک پلک درست کر کے اس میں کمال پیدا کرتا ہے۔ فطرت میں جو رجحان موجود تھا اور جسے وہ مکمل نہ کر سی اسے ذہن نے مکمل کر دکھایا۔ اس طرح ہمارا معیاری تخلیقی عمل فطرت کی کوتاہیوں اور نارسائیوں کو دور کرتا اور اس کی عدم آہنگی میں ہم آہنگی پیدا

کرتا ہے۔'' (۲۲)

جابر علی سید نے اقبال کے ہاں حسن کے تصور کے متذکرہ اجزا ان کی چار تخلیقات 'ہمالہ'، 'بزم انجم'، 'مسجد قرطبہ' اور قطعہ بہ عنوان 'جلال و جمال' سے اخذ کیے ہیں۔ اقبال کی فطرت پسندی کے تحت علامہ اقبال کے تصورحسن کو بیش تر ناقدین ادب نے پیش کیا ہے لیکن جابر علی سید کے ہاں اقبال کا تصورحسن اپنی ارتقائی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس حوالے سے ادوارِ کلامِ اقبال یا کثیر امثال سے اپنے نظریے کو الجھانے کی بجائے چار نظموں تک ہی محدود بحث میں تنقیدی و تحقیقی اشارے پیش کر دیے ہیں۔ ان چار منظومات میں سے نظم 'ہمالہ' کا تفصیلی ذکر اقبال کی فطرت پسندی کے ضمن میں آ چکا ہے۔ 'ہمالہ' میں تصورحسن کے حوالے سے جابر علی سید لکھتے ہیں:

> '' 'ہمالہ' میں حسن کا تصور فطرت کے حرکی مناظر کے تاثرات پر استوار نظر آتا ہے۔ فرازِ کوہ سے آتی ہوئی ندی، فیلِ بے زنجیر کی مانند اڑتا ہوا ابر، چشمۂ سیال، موج ہوا کا لہراتا دامن سب ہمالہ کو عناصر کی بازی گاہ بنائے ہوئے ہیں اور بازی گاہ حتمی طور پر Dynamic کا مرکز اصلی ہے جہاں حرکت پسندی اپنا دائمی اور حیاتیاتی اصول گاڑے ہوئے ہے ۔۔۔۔ ہمالہ کے حرکی عناصر Frolicsome ہوتے ہوئے بھی ایک سنجیدہ اور حیات آگیں طرزِ زندگی کے مظہر بنیادی ہیں۔'' (۲۳)

گویا ان کے مطابق اقبال کا تصورحسن ان کے تصورِفطرت سے منسلک ہے لیکن فطرت کے بھی حرکی مناظر جن میں حرکت و حرارت اور جدوجہد و کاوش کے عناصر موجود ہیں۔ اقبال کے تصورحسن میں حرکی عناصر کی تلاش اقبال کے نظریہ خودی اور نظریہ حرکت سے اخذ کی جا سکتی ہے۔ اقبال کے ہاں سکون و ثبات کو کوئی جگہ حاصل نہیں۔ کائنات کی حقیقت حرکی اور ارتقائی ہے اور اقبال کے تصورِحسن میں بھی ارتقا ہے، لکھتے ہیں:

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود (۲۴)

جابر علی سید نے اقبال کے تصورحسن کے بیان میں میں روایتی عجمی، صوفیانہ اور قرآنی اشارات کی نشان دہی کی ہے۔ اس کے نقطۂ آغاز میں حرکی عناصر کی موجودگی کا نکتہ دریافت کیا ہے اور 'جلال و جمال' اقبال کے نظریۂ حسن کی ٹھوس اور قطعی صورت ہے جہاں جمال کو مسترد کر کے جلال کو حسن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جابر علی سید نے حسن سے اقبال کے لگاؤ اور اثرات کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہاں ان کا نظریہ واضح ہوتا نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> '' 'مسجد قرطبہ' میں جلال و جمال کی اجتماعی صورت کے نظریے کی تشکیل سے پہلے

> ایک طویل عرصے تک اقبال مسلسل حسی حسن کی دل فریبیوں میں محو رہے۔ یہ عناصر قومی، اسلامی، اخلاقی اور انسانی موضوعات پر لکھی ہوئی نظموں یا 'بالِ جبریل' کی بے عنوان غزلیات میں منتشر ہیں۔(۲۵)

جابرعلی سید کا موقف یہ ہے کہ حسن اورفن دونوں جمالیات کے مظاہر ہیں۔ دونوں کا تعلق بالترتیب جمال اور جلال سے ہے۔ اقبال نے آفتابِ صبح، جگنو اور حسنِ مطلق کے دیگر مظاہر کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ اقبال کے ہاں تدریجی فکری ارتقا کی مثال مل جاتی ہے۔ اقبال کے تصورِ حسن کو افلاطون کے تصورِ حسن سے مماثل و متضاد و متخالف بتانے کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا، لیکن جابرعلی سید تصورات کے فنی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ شعری میں اقبال کی جدّت و اجتہاد پسندی کی طرف بھی جابرعلی سید نے خصوصی توجہ کی ہے۔ کلامِ اقبال کے فنی خصائص کے سلسلے میں جابرعلی سید کی دل چسپی کا ایک اہم گوشہ عروض ہے اور اس ضمن میں بھی انھوں نے کلامِ اقبال میں قطعہ اور رباعی تنازعہ کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس موضوع سے ان کی دل چسپی کا ایک ثبوت یہ کہ وہ تنقید میں جہاں کہیں موقع پاتے ہیں اس تنازعہ کی طرف ضرور اشارہ کرتے ہیں۔ بارہا اس مبحث کی موجودگی سے جابرعلی سید کا یہ موقف واضح طور پر سامنے آیا ہے۔ جیسا کہ ذکر ہوا، اقبال کا فنی ارتقا (جولائی ۱۹۷۸ء) میں ایک مضمون 'ابولعلامعری، ایرج میرزا اور اقبال' کے زیرِعنوان موجود ہے جس میں جابرعلی سید کا یہ نظریہ سامنے آتا ہے کہ اقبال کے ہاں موجود رباعیات دراصل رباعیات نہیں قطعات ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''ایرج میرزا اور اقبال دونوں نے قطعے کی ہیئت استعمال کی ہے۔ مختصر فلسفیانہ خیالات یا واقعات کے فوری اور آسان اظہار کے لیے قطعے کی صنف سب سے زیادہ کارآمد اور آسان ثابت ہوتی ہے۔ رباعی بھی قطعے جیسی صنف ہی ہے جو مختصر اور فلسفیانہ خیالات کے نظم کرنے کے لیے کارآمد ہے لیکن موخر الذکر بیش تر تجریدات کے لیے زیادہ موزوں ہے اور قطعہ فی البدیہہ گوئی، مختصر واقعات اور Concise مضامین کے جمالیاتی اظہار کے لیے زیادہ قوت رکھتا ہے۔ اقبال کے قطعاتِ فارسی و اردو کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اس میں معدودے چند اردو رباعیات بھی شامل ہیں جو سب کی سب ظریفانہ ہیں۔ زبورِعجم میں 'لالہ طور' کے عنوان کے تحت جو رباعیات لکھی گئی ہیں، اصل میں آہنگ کے اعتبار سے قطعات ہیں، رباعیات نہیں ہیں۔ بہ ہر کیف یہاں رباعی کی عروضی حیثیت پر کچھ لکھنا مقصود نہیں۔'' (۲۶)

آخری سطر سے اس امر کا جواز بنتا ہے کہ جو نکتہ جابرعلی سید نے یہاں پیش کی ہے بعدازاں اس پر تفصیلی بحث اقبال-ایک مطالعہ میں شامل مضمون 'اقبال اور قطعہ- رباعی تنازعہ' کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

جابرعلی سید ماہرِ عروض تھے۔ لہٰذا رباعی کے چوبیس اوزان کے حوالے سے ان کے بیان میں لچک اور رعایت

کا پہلو دیکھنے کو نہیں ملتا۔ وہ کہتے ہیں کہ کلیاتِ اقبال کے ناشرین نے 'لالہ طور' کی 'رباعیات' کے پیشِ نظر بالِ جبریل کے قطعات کو اب رباعیات کا عنوان دے دیا گیا ہے جس سے تنازع دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔(۲۷)

جابر علی سید کا یہ موقف یوں سامنے آتا ہے کہ اقبال کے قطعات کو سب سے پہلے عندلیب شادانی نے رباعیات قرار دیا ہے اور ان کا مزاج چوں کہ ہنگامہ پسندانہ تھا۔ انھوں نے اقبال کے ایک عروضی انحراف کو چونکانے والی بات بنا لیا اور تنازعہ کافی عرصے تک چلتا رہا۔ حالآنکہ بہ قول جابر علی سید:

> ''حیاتِ اقبال میں اگر کوئی اہل عروض قطعہ اور رباعی کا امتیاز تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے بیان کرتا تو وہ اسے تسلیم کر لیتے اور رباعیات بابا طاہر عریاں کے مرتب (عندلیب شادانی) کی غلط فہمی صاد کرتے۔ وہ بڑے انصاف پسند تھے جب وہ قطعہ اور رباعی کے بنیادی امتیازی آہنگ کے فرق اور تعدادِ ارکان کو محسوس کرتے تو فیصلہ اپنے ہی خلاف صاد کرتے۔'' (۲۸)

کچھ آگے چل کر اس ''عروضی انحراف'' کو جابر علی سید اقبال کا بابا طاہر عریاں سے متاثر ہونا بتاتے ہیں کہ اقبال ماہر عروض نہ تھے لیکن ان کی حسِ آہنگ مکمل تھی وہ قطعہ اور رباعی کے آہنگ کا فرق اچھی طرح محسوس کر سکتے تھے لیکن مرتب طاہر گیلگی کی عروضی اپج سے متاثر ہو گئے۔(۲۹)

اس تنازعے کو ختم کرنے کی سفارش تو جابر علی سید بھی کرتے ہیں لیکن یوں کہ اقبال کے قطعات حسن اور آہنگ میں رباعی سے کم نہیں۔ اس لیے اس تنازعے کو اب ختم تصور کرنا چاہیے اور اقبال کے اقدام یا تصورِ رباعی کو محض ان کی قلندرانہ بے نیازی پر محمول کرنا چاہیے۔ سید عابد علی عابد کے مطابق اقبال نے ایک رباعی بھی رباعی کے مسلمہ و مروّجہ اوزان میں نہیں لکھی جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈاکٹر گیان چند جین کے مقالے ''اقبال کی رباعیاں'' میں مذکور بحث کے مطابق اقبال کے منسوخ اردو کلام میں چار، بانگِ درا میں ایک اور پیامِ مشرق میں ایک (فارسی رباعی) موجود ہے۔ (۳۰)

فنی رموز کی گرہ کشائی کے ساتھ ساتھ فکری حوالے سے جابر علی سید نے اقبال کی نظموں کے تجزیے بھی کیے ہیں ''اقبال کے ایک مصرعے کی تشریح'' اسی طرح کی ایک تحریر ہے جس میں محققانہ حوالے سے تشریح کی گئی ہے۔ اقبال-ایک مطالعہ میں شامل یہ مضمون اقبالیات کی مختلف جہتیں مرتبہ یونس جاوید میں بھی شامل ہے۔ جابر علی سید نے اقبال کی نظم 'غالب' کے تیسرے بند کے دوسرے شعر کے مصرع ثانی کے حوالے سے رائج تشریحات و مطالب سے انحراف کیا ہے۔ نظم کے تیسرے بند کا متن یوں ہے:

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر ۔۔۔ محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہد مضمون تصدق ہے ترے انداز پر ۔۔۔ خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

آہ! تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرا میدہ ہے

گلشن و یمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے (۳۱)

جابر علی سید کے مطابق بانگِ درا کی جتنی بھی تشریحات اور کشافِ مطالب کے سلسلے میں سامنے آئے ہیں۔ سب میں 'غنچۂ دلی' اور 'گل شیراز' کی تعبیر مبنی بر غلط فہمی ہے جب کہ یہ دونوں اقبال کے بالکل نئے اور خیال انگیز استعارے ہیں 'غنچۂ دلی' سے مراد اردو زبان ہے جو غالب کے دور تک مشکل سے دوسو سال کی عمر کی تھی 'گل شیرازہ' فارسی زبان ہے۔ اس کی عمر اس وقت نو سال تھی۔ اقبال، حافظ، شیرازی، سعدی یا عرفی کو غالب سے کم تر نہیں کہہ سکتے تھے۔ (۳۲)

مختلف اردو شعرا نے اردو کے مرتبے سے متعلق اشعار کہے غالب نے بھی یوں کہا:

جو یہ کہے کہ ''ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی؟''

گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ ''یوں'' (۳۳)

یہی شعر غالب پر نظم کہتے ہوئے اقبال کے نیم شعور میں موجود تھا۔ جابر علی سید کے نزدیک اقبال کا یہ مصرع غالب کے شعر کی منظوم شرح ہے کیوں کہ اگلے ہی بند کے آخری مصرع میں:

شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے

کہہ کر اردو زبان کو شمع سے تعبیر کیا ہے اور بڑے فن کار شاعر کی ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ غالب اور اقبال کے مماثل پہلو کو جابر علی سید نے تحقیق طلب بتایا ہے۔ ان کی اس تحریر کے بعد اقبال اور غالب کی فکری مماثلت پر بیش تر مضامین و تصانیف دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ اقبال نجی خطوط میں نظریاتی نقاد کی صورت میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اس قطعے میں عظیم شعرا کے موازنے سے زیادہ غالب کا ایک معنی خیز مصرع پس منظر کو زیادہ وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

مطالب وتشریحاتِ بانگِ درا کو سامنے رکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ جابر علی سید اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک دو تشریحات کو ہی سامنے رکھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے یوسف حسین خان کی پیش کی گئی شرح کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے ''غنچۂ دلی'' سے مراد غالب کی شاعری اور ''گلِ شیراز'' سے مراد حافظ اور سعدی کی شاعری لی ہے اور مذکورہ بند کی تشریح یوں کی ہے:

> ''تیرا کلام، انسان کی قوت بیان کے لیے باعثِ صد عز و افتخار ہے اور تیرا تخیل اس قدر بلند ہے کہ ثریا بھی اس کی بلندی پر محوِ حیرت ہے۔ تیرا اندازِ بیان اس درجہ دل کش اور حسین ہے کہ خود مضامین، اس پر نثار ہونے کو آمادہ نظر آتے ہیں۔ تیرے کلام میں اس قدر حلاوت اور شیرینی ہے کہ اس کے سامنے حافظ اور سعدی کا رنگ بھی پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ شاعری میں تیرا ہم پلہ، تیسرے ہم عصروں میں اگر کوئی ہوا

ہے تو وہ جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے تھا لیکن زمانہ کا انقلاب ہے کہ تو جس شہر میں مدفون ہے وہ آباد ہے۔ یعنی تو اس قوم میں پیدا ہوا جو رو بہ زوال ہے اور وہ اس قوم میں پیدا ہوا جو رو بہ ترقی ہے۔'' (۳۴)

جابر علی سید جہاں یہ نکتہ پیش کرتے ہیں کہ اقبال کے شعر:

گیسوے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیِ پروانہ ہے (۳۵)

میں اردو زبان کو شمع سے تعبیر کرتے ہوئے بڑے شاعر کی ضرورت محسوس کی گئی ہے تو اس سلسلے میں دیباچۂ بانگِ درا از شیخ سر عبدالقادر کی ابتدائی سطور بہترین تائیدی کلمات کا کردار ادا کر سکتی ہیں:

''کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بہ دولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان پھر وجود میں آئیں گے اور اردو ادب کے فروغ کا باعث ہوں گے، مگر زبانِ اردو کی خوش اقبالی دیکھیے کہ اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب ہوا جس کے کلام کا سکّہ ہندوستان بھر کی اردو داں دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم و ایران بل کہ فرنگستان تک پہنچ گئی ہے۔

غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خان غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے؛ اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔'' (۳۶)

شیخ عبدالقادر اور جابر علی سید کے علاوہ بھی کلام اقبال کے دیگر ناقدین نے غالب اور اقبال کے ہاں فکری مماثلتیں تلاش کی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ، اسلوب احمد انصاری، پروفیسر عبدالمغنی اور محمد علی صدیقی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین قابلِ ذکر ہیں۔ یعنی جو نکتہ جابر علی سید نے پیش کیا اور اس کے ثبوت کے طور پر بانگِ درا کے دیباچے کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس تحقیقی نکتے کی تفصیل دیگر ناقدین کے ہاں بھی مل جاتی ہے۔ ''کلامِ اقبال میں فنونِ لطیفہ کے عناصر'' کے زیرِ عنوان مقالہ جابر علی سید کے مجموعۂ مضامین اقبال — ایک مطالعہ کے علاوہ تنقید اور لبرل ازم میں بھی شامل ہے۔ فنونِ لطیفہ کے حوالے سے ناقدین نے ہمیشہ اقبال کے تصورِ فنونِ لطیفہ پر بات کی ہے جب کہ جابر علی سید نے اس مقالے میں کلام اقبال میں فنونِ لطیفہ کے بنیادی عناصر کو تلاش کیا ہے اور اس ضمن میں فنِ تعمیر، مصوری، موسیقی اور سنگ تراشی کا جامعیت سے ذکر کیا ہے۔

اس مختصر مضمون میں جابرعلی سید کا موقف یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ جو بہت سے فنون کا مرقع ہے۔ان بنیادی فنون کی نمود اقبال کی شاعری کی صورت میں مل جاتی ہے کہ اقبال نے ان سے پیغام کی ترسیل اور اس کی ظاہری بافت میں بہ خوبی کام لیا ہے۔ جابرعلی سید کے خیال میں:

''اقبال کے کلام میں تمام فنونِ لطیفہ ایک آئیڈیل اور مثالی صورت میں متشکل نظر آتے ہیں جس کا دوسرا بامعنی نام فطرت ہے، اقبال کا کلام فطرت کی وسیع ترین باز آفرینی ہے اور کہیں کہیں اس پر ایک معنی خیز اضافہ بھی۔'' (۳۷)

درج بالا عبارت کی تشکیل کی بنیاد میں جابرعلی سید نے اقبال ہی کا ایک شعر سامنے رکھا ہے، شعر ہے:

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر (۳۸)

اگلا مضمون بہ عنوان ''مثنویاتِ اقبال اور الہلال'' ہے۔ مثنویات اقبال اور الہلال کے ساتھ ساتھ اس مقالے میں علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلقات کے بارے میں مخفی اشارے مل جاتے ہیں جو مزید تحقیق کے لیے راہیں متعین کرتے ہیں۔

تنقیدِ کلامِ اقبال کے سلسلے میں اقبال کا فنی ارتقا اور اقبال—ایک مطالعہ کے اکیس (۲۱) مضامین کے علاوہ جابرعلی سید کے دو مضامین اور بھی موجود ہیں جن کے عنوانات (i) کلامِ اقبال میں صناعی کے عناصر اور (ii) 'اقبال کا شعری اسلوب' ہیں۔ اوّل الذکر جابرعلی سید کے مجموعۂ تنقیدی مضامین تنقید و تحقیق میں شامل ہے جس میں انھوں نے صنعت تضاد، مراعاۃ النظیر، صنعتِ ترصیع، صنعتِ تکرارِ لفظ۔ واحد، تکرارِ مصرع و نیم مصرع، عکس و تبدیل، ترنم، آہنگ اور قولِ محال کے تحت کلام اقبال میں صناعی کے عناصر کی تلاش کی ہے۔ اقبال کے کلام کے فنی محاسن پر غور اور تجزیے کی یہ ابتدائی کاوش تھی۔ (۳۹)

اقبال کے معاصرین کی طرف سے اقبال کی زبان و آہنگ پر جو اعتراضات کیے گئے، ان اعتراضات کا شافی جواب دینے کی کوشش اب تک کی جاتی رہی ہے۔ جابرعلی سید کو لسانیات سے خاص دل چسپی تھی اور اس ضمن میں ان کے لسانی مقالات پر مشتمل مجموعوں کے علاوہ کلامِ اقبال پر عملی تنقید کے لسانی اشارے مل جاتے ہیں۔ پطرس بخاری اور ن۔م راشد کے اعتراضات کے حوالے سے جابرعلی سید نے علامہ اقبال کے شعری ڈکشن کا بھرپور دفاع کیا ہے۔ اقبال کے شعری اسلوب کے بارے میں جابرعلی سید کی واضح، مختصر اور جامع رائے ان کے مضمون 'اقبال کا شعری اسلوب' میں مل جاتی ہے۔ (۴۰)

جابرعلی سید نے اقبال کے شعری اسلوب کو دو اعتبار سے متعین کیا ہے یعنی لسانی اور جمالیاتی (جس میں جلال و جمال دونوں شامل ہیں) معترضینِ اقبال کے نزدیک بلند آہنگ عربی و فارسی الفاظ کلامِ اقبال کو شعری مرتبے سے گراتے ہیں جب کہ ''اقبال کا شعری اسلوب'' میں جابرعلی سید کے بیان کے مطابق:

> ''جہاں کہیں انتخاب الفاظ میں عربی الفاظ غالب ہوئے ہیں وہاں اقبال کا اسلوب اس کے شعری آہنگ کی تشکیل کرتا ہے اور اسلوب اور آہنگ کی لازمی رابطہ کاری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔'' (۴۱)

جابر علی سید نے اقبال کے شعری اسلوب کو مشرقی ادب فلسفہ اور تہذیب کے دائرہ کار میں لا کر پرکھا ہے۔ وہ واضح کرتے ہیں اقبال کا مغربی علوم کا مطالعہ وسیع اور گہرا تھا لیکن مغربی علوم اور فنون لطیفہ اقبال کی مشرقیت پر اثر نہ ڈال سکے اور یہ مشرقیت انتخاب الفاظ کے ساتھ ساتھ فراوانی الفاظ کی صورت میں قاری کو متحیر کرتی ہے۔ مطالعے کے ساتھ حافظہ اور شاعر کی انہظامی صلاحیت نے اس سلسلے میں اس کی بھرپور مدد کی ہے۔ کلامِ اقبال میں عربی و فارسی الفاظ کے استعمال کے پہلو بہ پہلو الفاظ کا جمالیاتی رخ اقبال کی فکر کو ابدیت بخشتا ہے اور اس ابدیت کے پس منظر میں مشرقی روایات بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ جابر علی سید اس حوالے سے بحث کو یوں سمیٹتے ہیں:

> ''اقبال کی شاعری اپنے اسلوب میں عربی و عجمی نظام بلاغت کے تمام معیاروں پر پوری اترتی ہے اور اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ الفاظ کا داخلی کھیل (Interplay) ایک ایسا عمل ہے جس کی مدد سے اقبال اپنے لیے آئیڈیل مجموعہ الفاظ وتراکیب تخلیق کر لیتا ہے۔ شاید ہی کوئی لفظ ایسا ملے گا جسے اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکتا ہو۔ الفاظ کا یہ رچاؤ اور مانوسیت بہت کم شاعروں کے حصے میں آتی ہے اور اگرچہ ایک ایسے شاعر کے حصے میں آتی ہے جو صرف داغ جیسا فصیح البیان شاعر کہلانا پسند کرتا ہے کہ اس سے بہت کچھ زیادہ چاہتا ہے اور اس کا مستحق بھی ہے۔ یہ علامہ اقبال جیسا شاعر ہی ہوسکتا ہے جس کا عظیم اور بلند اسلوب اس کے عظیم اور بلند پیغام سے ابھرتا ہے۔'' (۴۲)

یعنی اقبال کا اسلوب اس کے پیغام کو ترتیب نہیں دیتا بل کہ پیغام از خود اپنے لیے اسلوب کا انتخاب کرتا ہے۔

جابر علی سید کے تحریر کردہ یہ تیئیس مضامین اقبالیات میں ان کا ایک ممتاز اور نمایاں مقام متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان مضامین کی مجموعی نوعیت اقبال کے کلام کے فنی رموز کی گرہ کشائی ہے۔ ان مضامین کو تحریر کرتے ہوئے جابر علی سید نے اختصار اور جامعیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ 'اقبال اور فطرت' اور 'اقبال کے تین لہجے' جابر علی سید کے طویل مقالے ہیں۔ جابر علی سید کا تنقیدی اسلوب آسان ہے۔ وہ مختصر انداز میں تحقیقی وتنقیدی نکات بیان کرتے ہیں اور اس ضمن میں مدلل اسلوب کا سہارا لیتے ہیں۔ کہیں کہیں مثال مشکل اسلوب کی بھی مل جاتی ہے۔ 'اقبال اور ذوقِ استفسار' سے ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''شاید مرحلہ حیات طے ہونے پر بھی اس سوزِ دوام رکھنے والے کا مرحلۂ شوق ابھی طے نہ ہوا ہوگا اور اس کی روح مسائلِ زندگی پر مسلسل سر بہ گریباں ہو کر تفحص کرتی

ہوگی، جن صفات کی بنا پر کوئی ہستی موت سے بھی نہیں مر سکتی اس ہستی کی صفات سے فکرِ مسلسل ان کا شغل متین ہوگا۔'' (۴۳)

جابر علی سید نے اقبال شناسی میں ایک روایت کا آغاز کیا جس کے تحت کلام اقبال کی تفہیم فکری سے کہیں زیادہ فنی بنیادوں پر استوار ہوگئی۔ ان کے متذکرہ دونوں مجموعوں میں جن فنی مباحث کو چھیڑا گیا وہ اس سے پیش تر ایسی صورت میں نہیں ملتے۔ گویا وہ اقبالیاتی تنقیدات وتحقیقات میں ایک نئے دبستان کے مؤسس بن جاتے ہیں جو فکر سے زیادہ فنی محاسن کو ابھارتا ہے۔ جابر علی سید نے اقبال شناسی میں جو اختصاصات ظاہر کیے ہیں۔ ان تمام کا تعلق ان کی تنقیدی صلاحیت اور مطالعات کے ساتھ گہرا ہے۔ جابر علی سید کی ناقدانہ حیثیت کے تعین میں جو خصوصیات سر ابھارتی ہیں تنقیدِ کلامِ اقبال میں بھی ان کا ظہور ہوا ہے۔ مثلاً:

۱۔ جابر علی سید نے فکر کے مقابلے میں فن کے موضوعات کے حوالے سے تنقید کی ہے۔
۲۔ کلامِ اقبال پر ان کی تنقید، تنقید اور لبرل ازم کی عملی صورت ہے جو ہر طرح کی گروہ بندی اور اثریت سے آزاد ہے۔
۳۔ آزادانہ انداز نے دلائل و براہین کی ضرورت کو نبھاتے ہوئے تنقید میں استدلالی انداز کی توسیع کی ہے۔
۴۔ فن کے ساتھ ساتھ فکر پر بھی منفرد انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔
۵۔ کلامِ اقبال کی فنی تکنیکوں کی وضاحت کے ذریعے اقبال کی فلسفی سے زیادہ شاعرانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔
۶۔ کلامِ اقبال میں ہیئت، لہجہ، تکنیک، صناعی اور لفظ ومعنی کی مطابقت پر مباحث کے لیے پہلے سے موجود امثال کی بجائے کلامِ اقبال کی امثال پیش کر کے ان کی انفرادیت واضح کی ہے۔
۷۔ جابر علی سید سے پہلے اقبال کو فکری حوالے سے منفرد شاعر مانا جاتا رہا جب کہ جابر علی سید کے فنی وتکنیکی مطالعات اقبال کے کلام کی تکنیکی انفرادیت کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔
۸۔ جابر علی سید نے کلامِ اقبال کے مطالعات اصناف اور ہیئت کے حوالے سے پیش کیے۔ اس ضمن میں انھوں نے اصناف اور ہیئت کے فرق اور ان کے تقاضوں پر سیر حاصل بحث کے ساتھ ساتھ کلامِ اقبال سے امثال بہم پہنچائیں۔
۹۔ جابر علی سید نے ان تمام تر فنی مطالعات کی پیش کش میں اپنی منفرد صلاحیت یعنی مختلف زبانوں کے ادب سے تقابل کی صلاحیت کو بہ خوبی برتا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے تقابل کی تین سطحوں کا انتخاب کیا ہے جن میں (i) موضوعات (ii) زبان و بیان اور (iii) ہیئت و اصناف شامل ہیں اور یہ تقابل ذوالّلسانی اور سہ لسانی ادبی تقابل ہے۔
۱۰۔ جابر علی سید نے کلامِ اقبال کا تقابل وتجزیہ
(i) اردو سے عربی و فارسی
(ii) اردو سے انگریزی

(ii) عربی، فارسی، اردو سے اور انگریزی ادب کی سطح پر کر کے اپنے عالمی ادب کے مطالعات کا واضح اظہار کیا ہے۔
بہ حیثیت اقبال شناس جابر علی سید کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے کلامِ اقبال کا فنی حوالے سے تجزیہ کیا ہے اور فکری سطح پر تشریحی و توضیحی پہلو کے برعکس کلامِ کی فنی خوبیوں اور ہیئت کے تقاضوں اور معیار پر خیالات کا اظہار کیا۔ جابر علی سید نے تنقید کلامِ اقبال میں اپنے تنقیدی تصور 'لبرل ازم' کو عملی طور پر پیش کیا ہے۔ انھوں نے اقبالیات میں رائج کسی بھی تصور اور نظریے کو پہلے سے ذہن میں رکھے بغیر اپنی ذاتی رائے کو پورے اعتماد کے ساتھ پیش کیا۔

جابر علی سید نے کلامِ اقبال کے حوالے سے ایسے مباحث کو پیش کیا ہے جن پر ان سے پہلے خاطر خواہ تحقیقی و تنقیدی کام نہیں کیا گیا تھا یا پھر سرے سے قلم ہی نہیں اٹھایا گیا۔ اقبال کے ہاں ہیئت، لہجہ، تکنیک، صناعی، لفظیات اور اصناف کے حوالے سے جابر علی سید کی تحریروں سے پہلے بہت کم تحریریں ملتی ہیں۔ جابر علی سید نے اپنے تحقیقی و تنقیدی ذوق کے تحت اقبالیات کے سرمائے میں وقیع اضافہ کیا ہے۔ بلاشبہ جابر علی سید کی یہ کاوشیں اقبالیات میں ان کے نمایاں مقام کے تعین میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

حوالے و حواشی:

(۱) شیخ عطاء اللہ (مرتب): اقبال نامہ، لاہور: شیخ محمد اشرف تاجر کتب، ۱۹۱۹ء۔ ج۱، ص۱۰۸
(۲) ''اقبالیات میں ملتان کا حصہ مشمولہ اقبال (سہ ماہی)، لاہور: بزمِ اقبال، ش:۱-۴
(۳) علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی ۲۰۰۴ء، ص۵۶۸
(۴) جابر علی سید: اقبال کا فنی ارتقا ، ص۸-۹
(۵) جابر علی سید: اقبال کا فنی ارتقا، ص۱۳،۱۴
(۶) " ، ص۲۴-۲۵
(۷) " ، ص۳۴
(۸) " ، ص۳۷
(۹) " ، ص۵۴
(۱۰) " ، ص۸۰
(۱۱) " ، ص۸۲
(۱۲) جابر علی سید: اقبال کا فنی ارتقا، ص۹۰
(۱۳) " ، ص۹۹
(۱۴) جابر علی سید: اقبال کا فنی ارتقا ص۹۹
(۱۵) فتح محمد ملک: اقبال کی غزل مشمولہ فنون (جدید غزل نمبر)، ش:۱۹
(۱۶) جابر علی سید: اقبال کا فنی ارتقا ص۱۱۸
(۱۷) ایضاً

(۱۸) 〃 ص۱۵۰
(۱۹) جابرعلی سید: اقبال – ایک مطالعہ ، ص۳۰
(۲۰) 〃 ، ص۴۰
(۲۱) علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال، ص۴۴۰
(۲۲) جابرعلی سید: اقبال – ایک مطالعہ، ص۴۷
(۲۳) ایضاً
(۲۴) علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال، ص۴۵۴
(۲۵) جابرعلی سید: اقبال – ایک مطالعہ، ص۷۱
(۲۶) جابرعلی سید: اقبال کا فنی ارتقا، ص۴۷-۴۸
(۲۷) جابرعلی سید: اقبال – ایک مطالعہ، ص۸۷
(۲۸) سید عابد علی عابد: نفائس اقبال، ص۱۱۸
(۲۹) ایضاً
(۳۰) گوپی چند نارنگ: اقبال کا فن، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۳ء، ص۷۵-۸۰
(۳۱) علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال، ص۵۶
(۳۲) جابرعلی سید: اقبال – ایک مطالعہ، ص۱۱۹
(۳۳) اسد اللہ خان غالب: دیوان غالب، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص۱۶۲
(۳۴) یوسف سلیم چشتی: شرح بانگِ درا، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، س۔ن، ص۵۱
(۳۵) علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال، ص۵۷
(۳۶) ایضاً ، ص۳۵
(۳۷) جابرعلی سید: اقبال – ایک مطالعہ ، ص۱۳۶
(۳۸) علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال، ص۳۸۷
(۳۹) جابرعلی سید کا یہ مضمون صحیفۂ اقبال مرتبہ یونس جاوید میں بھی شامل ہے۔
(۴۰) جابرعلی سید کا مذکور مقالہ اقبال شناسی اور ایجرٹن کالج میگزین (بزم اقبال لاہور) مرتبہ دلشاد کلانچوی میں شامل ہے۔
(۴۱) دلشاد کلانچوی (مرتب): اقبال شناسی اور ایجرٹن کالج میگزین، لاہور: بزم اقبال، س۔ن
(۴۲) جابرعلی سید: اقبال – ایک مطالعہ ، ص۹۰
(۴۳) ایضاً ، ص